رُخسانہ نگار عدنان
فیصلہ
پاک سوسائٹی ڈاٹ کام
WWW.PAKSOCIETY.COM
WWW.PAKSOCIETY.COM
RSPK.PAKSOCIETY.COM
ONLINE LIBRARY
FOR PAKISTAN
PAKSOCIETY1
PAKSOCIETY

رخسانہ نگار عدنان

# فیصلہ

"لو بھئی عظمیٰ بیٹی! گوشت میں لے آیا اس بار دیکھنا کیا لاجواب گوشت لایا ہوں ایک گردن کروالی تھی میں نے اور ایک پوری ران اور اس نے بوٹی بھی بڑے مناسب سائز کی بنائی ہے۔ میں نے تو اسے کہہ دیا تھا بھئی ریزہ ریزہ نہ کر دینا خواہ مخواہ کرچیاں منہ میں آ کر بدمزہ کرتی ہیں۔ اس بار تو اس نے خوب جی لگا کر گوشت کاٹا ہے کہ۔۔۔"

میں نے گوشت کے دونوں تھیلے سامنے بیٹھی عظمیٰ کی طرف بڑھائے جو تیوری پر بل ڈالے مجھے باقاعدہ گھور رہی تھی۔ میں کچھ گھبرا سا گیا۔

"ابا جی۔۔۔ حد کرتے ہیں، کچن میں لے جائیں نا!" اس نے دانت کچکچا کر اپنے غصے کو دبانے کی کوشش کرتے ہوئے آواز دبا کر کہا۔

اس کے ایسے انداز تب ہی ہوتے تھے جب خود کو حد درجہ مہذب ظاہر کرنا ہوتا تھا۔ میں نے ناک پر پھسلتی عینک کو آنکھوں پر جمایا۔

"اوہ سوری ابا جی! میں تعارف کرانا تو بھول گئی۔" اس نے پھر سے مہذب بننے کی کوشش کی تو میرا دھیان اس کے ساتھ اور سامنے بیٹھی دونوں خواتین کی طرف گیا۔

"ابا جی! یہ نسرین خالہ کی بیٹی ہیں، نرگس آنٹی۔۔۔ یاد ہے نا آپ کو اور یہ نرگس آنٹی کی بیٹی عقیلہ۔۔۔ یہ لوگ ہمارے ساتھ والے گھر میں دو روز پہلے ہی شفٹ ہوئے ہیں۔۔۔ آپ پلیز گوشت کو تو لے جائیں۔"

آخری جملہ پھر سے اس نے دانت بھینچ کر کہا تھا اور میں سرہلاتا اندر کی طرف مڑ گیا۔

"خاتون کا چہرہ کچھ دیکھا دیکھا سا لگتا ہے، پر اللہ جانے کہاں دیکھا ہے۔ اب اس عمر میں دو دن اپنا چہرہ دیکھو آئینے میں تو بھولنے لگتا ہے۔ سالوں پہلے کی واقفیت کہاں یاد رہتی ہے۔" میں دل میں سوچتا گوشت رکھنے کچن میں آ گیا۔

وہاں ارم کھڑی شاید مہمان خواتین کے لیے چائے کا اہتمام کر رہی تھی کم از کم ٹرالی سے تو یہی لگ رہا تھا۔

"لو ارم بیٹی! یہ گوشت سنبھالو۔ اس بار اتنا اچھا گوشت بنوا کر لایا ہوں کہ کوئی بھی نقص نہیں نکل سکے گا۔" میں نے پہلے کی طرح لمبی چوڑی تمہید سے گریز کیا اور دو جملوں میں کہہ کر تھیلے کاؤنٹر پر رکھ دیے۔

ارم نے اپنی مصروفیت میں سے چند لمحے نکال کر اچٹتے سے انداز میں گوشت کے تھیلے ٹٹولے۔

"ابا جی! وہ چکن کا گوشت نہیں لائے؟" میں واپس مڑنے لگا تھا اس کی آواز سن کر وہیں تھم سا گیا۔

"اوہ، وہ تو میں بھول گیا۔" میں نے ہڑبڑا کر کہا۔

"یعنی پھر بھول گئے اور اٹھا کر یہ سارا ریڈ میٹ لے آئے۔ معلوم بھی ہے نا ڈاکٹر نے آپ کو ریڈ میٹ کتنی سختی سے منع کیا ہے۔ اتنا کولیسٹرول بڑھ جاتا ہے آپ کا مگر آپ کو کیا، آپ تو مزے سے ہائے وائے کرتے بستر پر لیٹ جاتے ہیں۔ آفت تو دوسروں پر

ہے۔ اس عمر میں بھی زبان کا چسکا نہیں جاتا۔ کچھ تو اپنا خیال کیا کریں اور میں۔۔۔ میں بھلا اب کیا پکاؤں گی۔ بچے چکن کے سوا کچھ کھاتے نہیں۔ ابھی فرمائش کر کے گئے ہیں چکن نگٹس کی سارا کچھ تیار کر کے بیٹھی ہوں کہ بس گوشت آتا ہے تو جلدی سے بنالوں گی اور آپ۔۔۔ اب کیا کہوں میں۔ جب آپ کو کچھ یاد نہیں رہتا تو کیوں ذمہ داری اٹھاتے ہیں کوئی۔"

وہ فوجی کرنل کی بیٹی تھی اور فوجیوں کے اسکول میں پڑھاتی تھی۔ گھر میں شوہر کو ڈکٹیٹ کرتے کرتے اب وہ سب کو ایک ہی ہنٹر سے ہانکنے لگی تھی۔

مگر اس وقت اس کا غصہ کچھ تو بجا تھا اور کچھ بے جا!

اور یہ اتنی بڑی ذمہ داری میں گزشتہ شاید چالیس سال سے اٹھائے ہوئے تھا۔ جیسے ہی ابا جی نے میرے ذمے یہ کام لگایا تھا پھر اماں کو میرے علاوہ اور کسی کا لایا گوشت پسند ہی نہیں آتا تھا۔ بیچ کے کچھ سال جب ملازمت کی مصروفیت کی وجہ سے میں نے خود ہی اس ذمہ داری سے ہاتھ اٹھالیا تھا۔ ملازم گوشت لاتا تھا اور سارے گھر والے چیختے تھے کہ کیسا بے ہودہ نہ گلنے والا کالی رنگت کا گوشت لاتا ہے۔

ریٹائر ہوتے ہی میں نے طاہر اور نوید کے کہنے پہ پھر سے یہ ذمہ داری اٹھالی اور آج بہو بیگم کہہ رہی تھیں۔ "یہ ذمہ داری اٹھاتے کیوں ہیں؟"

"اب کیا کروں میں اس گوشت کے ڈھیر کا۔ اسے سوائے آپ کے اور آپ کے دونوں بیٹوں کے اور کھاتا کون ہے۔ چکن کے پیسے کدھر ہیں؟" اس نے اچانک پوچھا۔

"وہ۔۔۔ وہ تو۔۔۔" ظاہر ہے جب دو تھیلوں میں بھر کر گوشت آئے گا تو یونہی تو نہیں آتا تھا۔

"غضب خدا کا، پورے ساڑھے تین سو روپے کلو کا گوشت اور آپ تھیلے بھر کر اٹھا لائے اور چکن پھر رہ گئی جو گھر بھر کھاتا ہے۔ اس کے لیے اب علیحدہ سے پیسے کہاں سے آئیں گے۔ ابا جی! کچھ تو رحم کریں اپنے بیٹوں پر جو اس خوف ناک مہنگائی کے زمانے میں اپنا خون پسینہ ایک کر کے اس سارے خاندان کو پال رہے ہیں، اب ایک بندے کی زبان کے چسکے کے لیے بال سب منہ دیکھیں گے۔ جب کمانے والوں کے بچوں ہی کچھ کھانے کو نہیں ملے گا تو لعنت ہے ان کے کمانے پر۔"

وہ گرجتی چلی گئی اور میں خود پر دو حرف بھیجتا شرمندہ کھسیانا سا وہاں سے کھسکنے لگا۔

"کیا ہوا کیوں شور مچارہی ہو مہمان بیٹھے ہیں۔" عظمیٰ اندر آکر بولی اور میں تیزی سے باہر نکل آیا۔

اب میں دو محاذوں سے توپوں کے گولے نہیں کھا سکتا تھا اور ذرا دیر بعد ان دونوں کی گھن گرج سے ہوا بھی یہی۔ اتنی شدید گرمی میں چار گھنٹے میں جو لگا کر آیا اور پھر اتنا وزن اٹھا کر آیا۔ جانے کیوں اس عمر میں ہمارا کوئی بھی عمل خواہ وہ کتنا ہی مشقت طلب کیوں نہ ہو قابل تحسین نہیں رہتا۔ میں افسردہ سا پچھلے برآمدے میں کرسی پر بیٹھ کر گئے دونوں کو یاد کرنے لگا۔

☼ ☼ ☼

"دادا! پارک میں چلیں، فٹ بال کھیلیں گے۔" وصی میرا دس سالہ پوتا میرے پاس آکر بولا۔

"نہیں پوتے! طبیعت اچھی ہے نہ موڈ۔ تم جا کر کھیل آؤ۔" میں نے کسل مندی سے کہا۔

"اوہ دادا! کیا بوریت ہے۔ چلیں میرے ساتھ باہر نکلیں گے تو خود ہی طبیعت بھی اچھی ہو جائے گی اور موڈ بھی بن جائے گا۔ اس اندھیرے سے کمرے میں بیٹھ بیٹھ کر آپ ڈپریشن کا شکار ہو رہے ہیں۔ کم آن۔" اس نے میری ایک نہیں سنی اور ہاتھ پکڑ کر کھینچتے ہوئے اپنے ساتھ لے چلا۔

وہ بچہ ہو کر مجھ سے زیادہ عقل مند تھا۔ مجھے پارک میں قدم رکھتے ہی اندازہ ہوا۔ پارک میں خوب چہل پہل تھی۔ بچے جگہ جگہ اپنے کھیلوں میں مشغول تھے۔ بڑے جن کی توندیں آپے سے باہر نکلی جارہی تھیں خوب زور و شور سے جاگنگ ٹریک پر واک کر رہے تھے۔ عورتیں بچوں کی پرامز لیے ادھر ادھر بیٹھی تھیں یا اپنی کسی ملنے والی کے ساتھ ٹہلتے ہوئے گپیں لگارہی تھیں۔



سورج ابھی مکمل طور پر غروب نہیں ہوا تھا مگر ہوا بڑی اچھی چل رہی تھی۔ میں نے جب اپنے گھر کے لیے یہاں پلاٹ پسند کیا تھا تو اس پارک کی وجہ سے اگرچہ اس وقت یہ ابھی اتنا ڈویلپ نہیں تھا پھر اس پارک کا اور میرا قریباً" اٹھارہ بیس برس کا ساتھ تھا۔ جب بھی اداس یا پریشان ہوتا یہاں چلا آتا۔ اس پارک میں بہت سے پودے، جو اب گھنے درخت بن چکے تھے یا بننے والے تھے میرے ہاتھوں کے ہی لگائے ہوئے تھے اور آج کل جو میری طبیعت پر قنوطیت سی طاری تھی جانے کیسے میں اپنے اتنے پرانے دوست ہمراز اور سب سے بڑھ کر غم گسار کو بھول گیا تھا۔

یوں جیسے بھرے میلے میں یک دم کوئی بچہ اپنے ماں باپ کا ہاتھ چھوٹ جانے سے بھیڑ میں گھبرا رہ جائے۔ بیوی کے ساتھ ستائیس اٹھائیس سال کی اتنی اچھی محبت بھری رفاقت کے اچانک تمام ہونے پر میری کچھ ایسی ہی حالت تھی۔

اپنے ہاتھوں سے اینٹ اینٹ جوڑ کر بنایا ہوا گھر ایک دم سے اجنبی سا لگنے لگا تھا۔ اپنی گود میں کھلائے بانہوں میں جھلائے اپنے ہی بچے ایک دم سے پرائے! عورت ہر رشتے، ہر روپ میں گھر کے مردوں کے بیچ پل کا کردار ادا کرتی ہے! اس بات کا احساس مجھے نسیمہ کے جانے کے بعد ہوا!

نسیمہ کے جاتے ہی ہم باپ بیٹوں کے درمیان عجیب سی اجنبیت آگئی تھی۔ اگرچہ وہ ہر طرح سے میرا خیال رکھتے اور میں ان کا خیال رکھتا، وہ میری دلجوئی میں کسر اٹھا نہ رکھتے اور میں ہر طرح سے ان کی تسلی کا اہتمام کرتا مگر پھر بھی کچھ کمی سی جیسے رہ جاتی اور وہ کمی، وہ خلا اس گھر میں مکمل عورت کا نہ ہوتا تھا۔ اگرچہ طاہر کی شادی ہو چکی تھی مگر جانے کیوں مجھے لگتا نسیمہ کے بعد اس گھر کا چلنا مشکل ہے۔

عظمیٰ کچھ طبیعت کی تھی۔ پہلے بچے کے سلسلے میں میکے جو گئی تو ساس کے مرنے پر بھی بس دو چار دنوں کے لیے آئی پھر چلا نہا کر آتو گئی مگر ہفتے میں پانچ دن اس کے میکے میں گزرتے تھے اور ہم باپ بیٹے اکثر ہوٹلوں کے کھانے کھاتے یا فریج کے باسی۔

میں طاہر سے شکایت نہیں کرنا چاہتا تھا مگر ایک روز جب ساتھ والے مرزا صاحب سے کسی کل وقتی ملازمہ کے لیے کہہ رہا تھا تو طاہر نے خوش ہو کر اس کی تائید کی۔ مجھے غصہ آگیا اور میں نے کہہ بھی ڈالا۔

"ہاں تمہاری بیوی جو پانچ ٹائم ہمیں کھلاتی پلاتی ہے۔ بے چاری تھکن سے نڈھال ہو جاتی ہے۔ سوچا اس کا کچھ ساتھ ہو جائے گا اور ہمارے جو معدے اس کے تازہ پکے کھانوں سے الٹ پلٹ ہوتے جارہے ہیں۔ ان کے لیے تبدیلی کا امکان ہو جائے گا۔" اور میرا یہ طنز ہی کافی نکلا۔

جانے طاہر نے عظمیٰ کو کیا سمجھایا۔ بہرحال پھر اس نے میکے جانا کم کر دیا۔

حالات کچھ بہتر ہوتے چلے گئے اور اگلے سال میں نے نوید کی شادی اس کی پسند سے ارم سے کر دی۔

دونوں بہوؤں میں بہت گہری نہ سہی بس اخلاقی مروت موجود تھی سو گھر میں کبھی کوئی بڑی چپقلش کھڑی نہ ہو سکی۔

بیٹے اپنی گھرداری اور بچوں میں مصروف ہو گئے اور میں ریٹائرمنٹ کے بعد بے حد فارغ!

سو گھر کے اکثر سودا سلف لانے کی ذمہ داری میں نے لے لی۔ اگرچہ بہوئیں گروسری کا زیادہ سامان خود ہی بڑے ڈیپارٹمنٹل اسٹورز سے لانا پسند کرتی تھیں۔ آج کل کے بچے جو الم غلم نوڈلز وڈلز اور اس طرح کی عجیب و غریب چیزیں پسند کرتے تھے۔ میں ان کا انتخاب کرنے سے قاصر تھا۔ سو گوشت، سبزی اور دوسرے اس طرح کے سودے میں بخوشی لے آتا تھا۔ مگر کل جس طرح ارم اور بعد میں عظمیٰ نے اور اس

کے بعد بیویوں کی تائید میں طاہر اور نوید نے مجھے کچھ منہ سے تو نہ کہا مگر جن نظروں سے دیکھا' وہ مجھے نکما اور ناقص العقل ثابت کرنے کے لیے کافی تھیں۔ کل سے دل پر عجب بوجھ سا آ گرا تھا۔

بے اختیار جی چاہا' میری بات سننے والا بھی کوئی ہوتا۔

نسیمہ یا... یا میری کوئی بیٹی۔ خدا نے مجھے اپنی رحمت سے محروم رکھ کر یقیناً میری کسی گناہ کی سزا ہی دی ورنہ آج کوئی میری ہمدردی میں بولنے والا تو کوئی ہوتا۔

وہ کسی سیانے کا قول ہے کہ خدا کمینوں کو بیٹیاں نہیں دیتا! میں کمینہ تو نہیں تھا مگر جانے کیوں خدا نے مجھے بیٹی نہیں دی۔

میں ٹریک پر چل کم رہا تھا سوچ زیادہ رہا تھا۔

چلتے چلتے پیروں میں شدید درد ہونے لگا۔

"بیچاری ارم ٹھیک ہی کہتی ہے پھر کولیسٹرول بڑھ جاتا ہے تو آپ تو مزے سے بستر پر دراز ہو جاتے ہیں۔ شامت دوسروں کی آتی ہے۔" میں خود ترسی کے انداز میں ہنسا۔

"بھلا اتنی شدید تکلیف کے ساتھ کوئی بستر پر آرام سے بھی لیٹ سکتا ہے۔" وصی اپنے دوستوں کے ساتھ کھیل میں مشغول ہو چکا تھا۔

میں نے کسی خالی بینچ کی تلاش میں نظریں دوڑائیں۔

سب ہی بینچ بھرے ہوئے تھے۔

اور مجھ سے کھڑا ہونا مشکل ہو رہا تھا۔ نیچے زمین پر بیٹھ کر اٹھنا بیٹھنا بھی زیادہ دشوار لگتا ہے۔

آخر صبر نہ ہو سکا تو ایک بنچ جس کے کنارے کوئی عورت بیٹھی آرام سے نٹنگ کر رہی تھی میں ذرا ڈھٹائی دکھاتے ہوئے اس بنچ کے دوسرے کنارے پر ٹک گیا۔

پورے جسم کا بوجھ اٹھائے پیروں کو جیسے کسی نے راحت دے دی ہو میں بیٹھ کر گہرے گہرے سانس لینے لگا۔

عورت کے پاس ہی پرام رکھی تھی جس میں آٹھ دس ماہ کا گول مٹول بچہ اچھل رہا تھا اس کے قریب چھ سات سال کی بچی اپنی بال کے ساتھ کھیل رہی تھی اس بچی کو کھیلتے دیکھ کر ہی پرام میں بیٹھا وہ بچہ مچل رہا تھا۔

میرے لبوں پر بے اختیار مسکراہٹ سی آ گئی۔

خاتون نے ذرا ہاتھ روک کر گردن موڑ کر میری طرف دیکھا۔

"سوری۔ میں بلا اجازت بیٹھ گیا... اصل میں پیروں میں اتنی شدید تکلیف تھی کہ مجھ سے مزید کھڑا نہیں ہوا جا رہا تھا۔" نظریں ملنے پر میں نے کچھ شرمندگی سے وضاحت پیش کی۔

"کوئی بات نہیں۔" اس نے متانت سے مسکراتے ہوئے کہا اور میرے دماغ میں جھماکا ہوا۔

"ارے یہ تو شاید وہی خاتون ہیں جو کل عظمیٰ کے ساتھ ڈرائنگ روم میں بیٹھی تھیں۔" میں نے سوچا۔

"پوتا ہے آپ کا؟" میں نے یوں ہی بات بڑھانے کو پوچھا۔

"نہیں... نواسا۔" وہ سلائیوں پر چلتے تیز تیز ہاتھوں کو روکے بغیر بولی۔

"اچھا تو آپ اپنی بیٹی کی طرف آئی ہوئی ہیں۔" میں اجنبی لوگوں سے اتنی جلدی بے تکلف نہیں ہوتا تھا مگر جانے کیوں میرے منہ سے نکل گیا۔

خاتون ہاتھ روک کر ساکت سی ہو گئیں۔

"اور یہ شاید آپ کی نواسی ہیں؟" میں نے اس کے یوں ساکت ہونے کا نوٹس لیے بغیر کہا۔

اس نے پھر کوئی جواب نہیں دیا۔

"چلو شانزے بیٹا! شام ہو رہی ہے۔ گھر چلیں۔" وہ یک دم اٹھ کھڑی ہوئی اور اپنا نٹنگ کا سامان شاپر میں ڈال کر اسے پرام کی باسکٹ میں رکھا اور دوپٹہ درست کرتی پرام دھکیلنے لگی۔

"نانو! ابھی کچھ دیر اور۔" بچی کا دل ابھی کھیلنے سے بھرا نہیں تھا لہٰذا مچل گئی۔

"نہیں دیر ہو جائے گی راستے میں۔" آگے جاتے ہوئے اس کی آواز مدھم ہو چکی تھی۔

"شاید خاتون کو میری کوئی بات بری لگی ہو یا شاید اس طرح بینچ پر بلا اجازت آ بیٹھنا ہی۔" اس کے یوں اچانک چلے جانے پر میں نے سوچا۔

اب میں پھر بے دھیانی سے اردگرد پھرتے خوش گپیاں کرتے لوگوں کو دیکھ رہا تھا۔

بچے باہر اپنے کھیلوں اور جھولوں میں مگن تھے۔ میرے پیروں کا درد لمحہ بہ لمحہ بڑھتا جا رہا تھا۔

وصی کو میں دو چار بار آوازیں دے کر رہ گیا۔ اس کا دھیان بالکل بھی میری طرف نہیں تھا۔ میں نے تھک کر بینچ سے ٹیک لگا لی۔

فضا میں دم توڑتی روشنی شفق کے کناروں پر جمع ہو رہی تھی اور اس روشنی میں نادیدہ اندھیرے آہستہ آہستہ گھل رہے تھے بالکل غیر محسوس طریقے سے۔ جیسے ہمارے توانائی سے بھرپور جسم کے طاقت ور ریشوں میں کمزوری اور بڑھاپا بالکل غیر محسوس طریقے سے اترنے لگتا ہے اور بالکل غیر محسوس انداز میں اچھے بھلے جسم کو لاغر و ناتواں کرتا چلا جاتا ہے۔

یہی پارک تھا اور یہی میں ــــ صبح اور شام میں صرف اس کے جاگنگ ٹریک کے میں دس دس چکر بڑے آرام سے لگا لیا کرتا تھا اور پھر بھی تھکتا نہیں تھا۔

اور اب محض چلنے ہی سے وہ بھی دو یا تین چکروں کے بعد اتنی تھکاوٹ کمزوری اور سب سے بڑھ کر یہ پیروں کا درد کیسا نڈھال کر دیتا ہے۔

"چلیں دادا!" وصی جانے کب میرے پاس آ کر کھڑا ہوا تھا۔

"ہاں چلو۔" میں اپنے خیالوں سے چونکا۔

ملگجا اندھیرا پارک کے چاروں اور چھا چکا تھا۔ لوگ اور بچے تیزی سے پارک سے نکل کر جا رہے تھے۔

ہم دونوں دادا پوتا آہستہ آہستہ چلتے ہوئے باہر آ گئے۔

وصی مجھے اپنے اسکول میں ہونے والے میچ کی تفصیل بتا رہا تھا جسے میں ہوں ہاں کرتے سن رہا تھا۔

"بیٹا! یہ ادھر لیٹر بکس کدھر ہے؟" ہم دونوں نے جھک کر دیکھا۔

دائیں طرف وہی خاتون اپنے نواسا نواسی کے ساتھ کچھ تھکی تھکی سی پوچھ رہی تھیں۔

"لیٹر بکس؟" وصی نے استعجاب سے میری طرف دیکھا۔

"مجھے یہ خط پوسٹ کرنا تھا۔ میں ادھر ادھر دیکھ آئی ہوں نظر ہی نہیں آیا۔"

"لیٹر بکس تو مارکیٹ کے بالکل آخر میں آتا ہے۔ مارکیٹ کا آپ کو پتا ہے نا؟" مجھے بتانا ہی پڑا۔

"اوہ! اس طرف تو میرا دھیان ہی نہیں گیا بلکہ مارکیٹ تک تو ہم گئے تھے مگر آخر تک نہیں۔ ان بچوں نے کچھ چیزیں بھی لینی تھیں۔"

بچوں کے ہاتھ میں موجود چپس، بسکٹ وغیرہ ان کے مارکیٹ جانے کا پتا دے رہے تھے۔

"اب تو خاصی شام ہو گئی۔ کل صبح سہی بہت شکریہ بتانے کا۔" وہ کہہ کر دونوں بچوں کے ساتھ چل پڑیں۔

چونکہ ہمیں بھی اسی طرف جانا تھا۔ اس لیے ساتھ ساتھ چلتے ہوئے ادھر ادھر کی باتیں بھی کرتے رہے۔

گھر آنے پر وہ اپنے گھر اور ہم اپنے گھر کی طرف مڑ گئے۔

میں نے گیٹ میں داخل ہونے سے پہلے یونہی مڑ کر دیکھا وہ بھی ادھر ہی دیکھ رہی تھی اور پھر مسکراتے ہوئے اندر چلی گئی۔

اور میرے دماغ میں جیسے کچھ کلک ہونے لگا۔

"یہ چہرہ پہلے کہیں دیکھ رکھا ہے کہاں؟"

مجھے رات کو سونے تک بھی یہ بات یاد نہ آ سکی اور لاکھ سر جھٹکنے کے باوجود یہ دماغ سے اتر بھی نہ سکی۔

اور اگلی صبح بے دار ہوتے ہی مجھے یاد آ گیا کہ یہ دیکھا بھالا چہرہ کس کا ہے ــــ نرگس کا اور نرگس ــــ میں



سوچتا ہی چلا گیا۔

☼ ☼ ☼

"امی! آخر یہ کام ہی کہتا کیا ہے؟" میں پچھلے صحن میں لگی کیاریوں کو پانی دے رہا تھا جب دیوار کے دوسری طرف بولتی عقیلہ کی آواز مجھے سنائی دی۔

"اور یہ خط ــــ خدا کا واسطہ ہے امی! آج کل خط کا کون سا زمانہ ہے' وہ فون نمبر ای میل ایڈریس کچھ تو دے۔ میں خود اس سے بات کروں۔ آخر میں کب تک جاوید کو ٹالوں۔ وہ اب ادھر چند ہفتے بھی رکنا نہیں چاہتے۔ آپ کو میری پوزیشن کا اندازہ ہے پھر بھی۔" وہ آخر میں کچھ عاجزی سے بولی تھی۔

"جانتی ہوں بیٹی! اسی لیے تو ــــ میری تو خود کوشش ہے۔" وہ اتنا کہہ کر چپ ہو گئی۔

"ہر روز آپ اسے خط لکھ رہی ہیں اور بے مروتی دیکھیں بھائی کی۔ کبھی توفیق نہیں ہوئی۔ بہن سے سلام دعا ہی کر لے۔ اس کے حصے کا سارا بوجھ اٹھایا ہوا ہے دو سال سے میں نے۔" وہ جتانے والے انداز میں کہہ رہی تھی۔

"کہہ رہا ہے اگلے مہینے آنے کی کوشش کرے گا۔" وہ پست آواز میں بولی۔

"ہونہہ اگلے مہینے ــــ یہ تو وہ گزشتہ ڈیڑھ سال سے کہہ رہا ہے۔ امی! جاوید کی ممی کا اگلے مہینے آپریشن ہے' وہ اب زیادہ دیر رک نہیں سکتے نا آپ ہمارے ساتھ جانا چاہتی ہیں اور نہ ــــ جاوید کی عادت اس معاملے میں اتنی عجیب سی ہے۔ ایک دم سے روکھے بے مروت بن جاتے ہیں۔ ان کا گھر' بچے سب سنبھالتی ہوں اور ایک میری ماں کی دفعہ ــــ کچھ بولوں تو آپ منع کرتی ہیں حالانکہ اتنے مہینوں میں وہ دل سے کوشش کرتے تو یقیناً" آپ کا ویزا بن چکا ہوتا مگر وہ اس معاملے میں بالکل بھی کوآپریٹو نہیں ــــ سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں۔ آپ کو اکیلا چھوڑ کر بھلا کیسے جا سکتی ہوں اور وہ کامی کا بچہ ــــ ساری ذمہ داریوں سے فرار ہو کر منہ چھپا کر بیٹھ گیا ہے۔"

وہ بولتے بولتے شاید وہاں سے چلی گئی تھی کیونکہ دیوار کے پار اب مکمل خاموشی تھی۔

"تو یہ معاملہ ہے۔" ساری بات میری سمجھ میں آ گئی تھی۔

"اسی لیے اس شام جب میں نے کہا تھا کہ اچھا آپ اپنی بیٹی کی طرف آئی ہوئی ہیں تو یہ چپ ہو گئی تھی۔" میں اب سست ہاتھوں سے پودوں کو پانی دے رہا تھا۔

کچھ دیر بعد پائپ وہیں چھوڑ کر کرسی پر آ بیٹھا۔

عقیلہ کے شوہر جاوید سے ایک دو بار آتے جاتے ملاقات ہوئی تھی چہرے سے ہی خشک مزاج انسان لگتا تھا۔

مجھے لگا میری تمام تر ہمدردیاں نرگس کے ساتھ ہیں اور کیوں نہ ہوتیں۔

"ابا جی! آپ تو ادھر آ کر بیٹھ ہی جاتے ہیں۔ یہ کچھ سامان ہے یہ بازار سے ابھی لا دیں۔ اور پلیز میں ذرا شاپنگ کے لیے جا رہی ہوں بچے اندر ہی ہیں خیال رکھیے گا۔" ارم کسی طوفان کی طرح آئی تھی اور سبزی اور دوسرے سامان کی لسٹ مجھے تھما کر جانے لگی۔

"ارم بیٹا! تم بازار تو جا ہی رہی ہو تو خود ہی یہ سامان لے آنا۔" میں اس وقت کہیں بھی نہیں جانا چاہ رہا تھا۔ طبیعت بوجھل سی ہو رہی تھی اور پھر باہر اچھی خاصی گرمی بھی تھی۔

"ابا جی! مجھے ادھر نہیں' مین مارکیٹ جانا ہے۔ پردے وغیرہ پسند کرنے میں اور کچھ دوسری گھر کی چیزیں ــــ اب یہ کھانے کا سامان ہے کچن کے لیے چاہیے۔ عبدل پکا لے گا ہمارے آنے سے پہلے کچھ ــــ آپ پلیز جلدی لے آئیں۔ اس کو کھا لانے کو تو آدھے سے زیادہ پیسے بھی کھا جائے گا اور سارے بازار کا گند اٹھا لائے گا۔ ابھی دھوپ زیادہ تیز نہیں۔ پلیز جلدی سے لے آئیں جا کر۔" وہ کہتے ہوئے جس

طرح آئی تھی اسی طرح باہر نکل گئی۔

عبدل اور شہناز کی موجودگی کے باوجود بازار کے آدھے سے زیادہ کام مجھے ہی کرنا پڑتے تھے۔

"اور یہ پیروں کا درد۔۔۔" میں کراہتے ہوئے اٹھ کھڑا ہوا۔

☆ ☆ ☆

"ابا جی! آپ طاہر بھائی سے کہیں یا تو وہ اوپر شفٹ ہو جائیں یا پھر میں اور ارم اوپر چلے جاتے ہیں بچوں کے ساتھ" نوید رات کو میرے کمرے میں آیا تو دو چار ادھر ادھر کی باتوں کے بعد کہنے لگا۔

"کیوں؟ خیریت؟" مجھے کچھ حیرت سی ہوئی۔

"اوپر والا پورشن تو سال بھر پہلے سے مکمل ہو چکا تھا نسیمہ کی زندگی میں ہی میں نے اس کی تعمیر شروع کرادی تھی۔ بعد میں کچھ عرصہ کام رکا رہا۔ کام مکمل ہونے کے دوران اور بعد میں بھی کچھ عرصہ میں اوپر ہی رہتا رہا پھر ان پیروں کے درد اور دوسری تکلیفوں کی وجہ سے مجبوراً" مجھے نیچے آنا پڑا۔

میرے اور نسیمہ کے کمرے میں اب طاہر اور عظمیٰ کے بچے سیٹ ہو چکے تھے بلکہ انہیں یہ ایک کمرہ بھی کم پڑ رہا تھا۔

میری جگہ پورے گھر میں اوپر کے سوا کہیں نہیں رہی تھی۔

"آپ گیسٹ روم میں شفٹ ہو جائیں۔" طاہر اور عظمیٰ نے آسان حل پیش کر دیا۔

تجویز اچھی تھی۔ گیسٹ روم گیٹ سے ذرا ہٹ کر بڑے اچھے دو کمروں باتھ اور کاریڈور پر مشتمل تھا اگرچہ گھر کی بنیادی عمارت سے ہٹ کر تھا مگر نیچے ہونے کی وجہ سے میرے لیے قابل قبول تھا۔

دونوں بھائی باقی گھر میں رہنے لگے۔

اوپر کے پورشن میں ضروری و غیر ضروری سامان پہنچنے لگا اور اب نوید مجھ سے یہ کہہ رہا تھا۔

"ابا جی! وہ ارم کے بھائی اور بھابی جرمنی سے آ رہے ہیں۔ تین چار ماہ رہیں گے۔ اب ظاہر ہے گیسٹ روم میں تو آپ ہیں ان کے دو بچے بھی ہیں۔ ایک بیڈ روم ان کو بھی چاہیے۔ اس لیے یا تو ہم لوگ اوپر شفٹ ہو جاتے ہیں یا طاہر بھائی کی فیملی۔"

بالآخر وہ نازک لمحہ آ ہی گیا تھا جب وحدت کر حصوں میں تقسیم ہو جانا ہوتا ہے۔

دونوں اکٹھے رہتے تھے ان کے بچے بھی کھیلے ملے اکٹھے اسکول آتے جاتے ایک ہی کچن ایک ہی ڈائننگ ٹیبل۔۔۔ میرے لیے عمر کے اس حصے میں یہ منظر بہت سکون آور ہوتا تھا۔

"ٹھیک ہے۔ میں طاہر سے بات کر لیتا ہوں جو وہ کہے گا بتادوں گا۔" وہ فیصلہ تو کر چکا تھا صرف مجھے آگاہ کرنے آیا تھا۔ اس کا مقصد مشورہ یا رائے طلب کرنا نہیں تھا۔

اور طاہر و عظمیٰ جیسے پہلے سے تیار تھے۔

"ٹھیک ہے ابا جی! ہم اوپر شفٹ ہو جاتے ہیں۔" انہوں نے آرام سے رضامندی دے ڈالی۔

اور میں متذبذب سا بیٹھا رہ گیا کہ میرا کھانا پینا جو پہلے مشترکہ گھر میں ہوتا تھا اب تم دونوں کیسے تقسیم کرو گے۔ میں منتظر رہا اور وہ دونوں اوپر کے کمروں کے حساب سے اپنے سامان کی سیٹنگ ڈسکس کرتے ہوئے چلے گئے۔

پھر بعد کے دنوں میں مجھے کھانے کے لیے بلاوا آنے کے بجائے کھانے کی ٹرے کبھی صبوحی کے ہاتھوں یا پھر شہناز کام سے فارغ ہو کر دے جاتی۔

ارم کے ساتھ میری ذہنی ہم آہنگی کم ہی تھی۔ عظمیٰ میری طبیعت کو قدرے سمجھتی تھی۔ وہ اب اوپر تھی اور میرے لیے سیڑھیاں چڑھنا مشکل تھا۔

نوید کبھی کبھار رات کے کھانے پر مجھے بلوا بھیجتا یا میں خود ڈھیٹ بن کر پہلے سے وہاں موجود ہوتا اور مجھے اپنی ڈھٹائی کا احساس یوں ہوتا کہ ارم میری موجودگی میں اور بھی چڑچڑی اور بدلحاظ سی ہو جاتی تھی۔

وجہ بے وجہ بچوں کو ڈپٹتی مہنگائی اور بلوں کی زیادتی کے رونے روتی عبدل اور شہناز کی کام چوری کو کوستی



اور میں چور بن کر دبکا رہتا۔

اس کی بدمزاجی سے بچنے کے لیے میں اسی گیسٹ روم میں پڑا رہتا یا چپکے سے باہر نکل جاتا۔

اور ارم کو جب ضرورت ہوتی کسی کام کے سلسلے میں بل جمع کروانے ہوتے یا سودا سلف لانا ہوتا بلا جھجک مجھے آکر آرڈر کر جاتی۔ یہ گھر میرا تھا اور میں اپنے بیٹوں کے در پہ نہیں پڑا تھا۔ میری پنشن بھی اچھی خاصی آتی تھی اور بینک میں بھی اچھی خاصی رقم موجود تھی جس پر ماہ بہ ماہ منافع بھی آتا تھا سو میں ان پر بوجھ تو کسی طرح بھی نہیں تھا۔ بلکہ اکثر گھر کے چھوٹے موٹے اخراجات بن کہے پورے کرتا تھا۔

ارم کی بدتمیزی پر میں یوں چپ رہتا کہ بات بڑھ نہ جائے۔ بیٹے جو ابھی بھی مجھ سے بہت محبت اور احترام سے بات کرتے ہیں آتے جاتے ڈاکٹر' دوا' طبیعت' ضرورت ہر چیز کے بارے میں سرسری سا سہی پوچھتے ضرور ہیں۔

اس عمر میں اس سرسری سے پوچھنے کی کیا اہمیت ہوتی ہے۔ یہ کوئی مجھ جیسے بڈھوں سے پوچھے۔

اس کا اندازہ مجھے دن بدن نرگس کے ساتھ ہونے والے اسکول کو دیکھ کر زیادہ ہونے لگا تھا مگر میں اس سے ہمدردی کرنے سے بھی قاصر تھا اس کی وجہ؟۔

"ابا جی! آج بجلی کے بل کی آخری تاریخ ہے پلیز۔ یہ تو جمع کروا آئیں۔" ارم حسب عادت کھٹ کھٹ کرتی بلا اجازت میرے کمرے میں گھستی چلی آئی تھی اور ہاتھ میں پکڑا بل اور پیسے میز پر رکھ کر اگلی بات کیے بغیر واپس چلی گئی۔

"بینک مارکیٹ میں تھا اور مارکیٹ۔۔۔ اور آخری تاریخ کا مطلب بھی لائن میں لگنا۔۔۔ مجھے سوچ کر ہی بخار سا ہونے لگا۔

☆ ☆ ☆

"السلام علیکم کیا حال ہیں؟" وہ بھی اسٹور میں شاپنگ کر رہی تھی۔ میں نے اپنے سامان کی ٹرالی ایک

طرف کرتے ہوئے کہا۔

"وعلیکم السلام میں ٹھیک ہوں، آپ سنائیں۔" اس کا انداز کچھ کترانے والا تھا میں ہلکا سا مسکرایا۔ گویا ان کے دل میں بھی کچھ ہے۔

دو چار ادھر ادھر کی باتوں کے بعد وہ جلدی سے کاؤنٹر سے اپنا سامان لے کر باہر نکل گئی۔

"آپ گھر نہیں جارہیں۔" میں اس کے پیچھے ہی چل پڑا تھا۔

"نہیں، وہ مجھے ذرا یہ خط پوسٹ کرنا تھا۔" وہ بازار کی اس سمت جارہی تھی جس کے آخر میں لیٹر بکس تھا۔

"لائیں۔ مجھے دے دیں میں پوسٹ کر آتا ہوں۔ آپ یہاں چھاؤں میں کھڑی ہوجائیں۔ خاصی دھوپ ہے۔"

"نہیں شکریہ میں چلی جاؤں گی۔" وہ کہہ کر فوراً آگے بڑھ گئی۔ میں گھر کی طرف مڑ آیا۔

شام کو میں ننھے ولید کو لیے پارک میں چلا آیا۔

نرگس پہلے سے اپنے نواسے کی پرام لیے موجود تھی۔" اس شام کی طرح اس کے ہاتھ میں اون سلائیاں نہیں تھیں شاید اسے بھی احساس ہوگیا تھا کہ اتنی شدید گرمی میں اون کی سلائیاں لے کر بیٹھنا کتنا مضحکہ خیز ہوسکتا ہے میں ان کے روکھے رویے کے باوجود ٹریک کے دو چکر لگا کر اس کے بینچ کے کنارے بیٹھ گیا۔

"کب آرہا ہے آپ کا بیٹا؟" میں نے بیٹھنے کے تھوڑی دیر بعد پوچھا۔

"معلوم نہیں۔" بے اختیار اس کے منہ سے نکلا اور پھر جیسے خود ہی چونک گئی۔ "اگلے مہینے شاید آجائے۔"

"تو گویا اس کا واپسی کا کوئی پروگرام نہیں۔" میں ذرا دیر بعد بولا تو اس نے تردید کی نہ تائید۔ بس نواسے کے پرام کو آگے پیچھے جھلاتی رہی۔

"عقیلہ اور جاوید شاید باہر جانا چاہتے ہیں۔" میں جانے کیوں اس کے دل کے بوجھ کو شیئر کرنا چاہ رہا تھا۔ انوکھا سا احساس تلاقی تھا جو اس کے بارے میں جانتے ہی میرے دل میں جاگ اٹھا تھا اور روز بروز توانا ہوتا چلا جارہا تھا۔

"ہاں جاوید کی والدہ کا آپریشن ہے۔ یہاں جاب بھی اس کو اچھی نہیں مل سکی، وہاں اس کا بھائی سیٹ ہے۔ اپنا بزنس ہے۔ اس لیے جاوید کو بھی بلا رہا ہے۔ ظاہر ہے ان کے بچوں کا مستقبل بھی بن جائے گا۔ اب وہ مجھ بڑھیا کے اکیلے رہ جانے کے خیال سے کب تک اپنی زندگی کے اس گولڈن چانس کو نظر انداز کرتے رہتے۔"

"تو تم ان کے ساتھ کیوں نہیں چلی جاتیں۔" میرے منہ سے بے اختیار نکلا اور جملہ بولتے ہی مجھے احساس ہوا میں نے اس کی دل شکنی میں اضافہ کیا ہے۔

جاوید اسے اپنے ساتھ لے جانا نہیں چاہتا یہ اس روز عقیلہ کی باتوں سے پتا چل تو رہا تھا۔ مگر وہ خاموش بیٹھی اپنی گہری گہری لکیروں والی ہتھیلی کو دیکھتی رہی۔

"اور کامران۔۔۔ تمہارا بیٹا کیا کہتا ہے؟"

"کچھ بھی نہیں۔" وہ گہرا سانس لے کر سامنے کی طرف بھاگتے بچوں کو دیکھنے لگی۔

"اچھا بھلا گھر تھا اپنا، اس کی ضد کی خاطر بیچنا پڑا کہ باہر جاکر زندگی بدل جائے گی میری۔ ان ہی دنوں جاوید کو بھی پیسوں کی ضرورت تھی گولڈن شیک ہینڈ لے کر اس نے رقم بزنس میں لگائی تھی جو ڈوبنے کے قریب تھی۔ مکان بکتے ہی عقیلہ کا حصہ تو مانگا ہی مزید قرض بھی مانگ لیا۔ وہ جو کہتے ہیں آدمی کا دشمن اس کا پیٹ ہی ہوتا ہے۔ معاشی طور پر بھی اور اخلاقی طور پر بھی۔ ماؤں کی کمزوری بیٹے ہی تو ہوتے ہیں اور بیٹوں کو بھی ماؤں کی اس کمزوری کا علم ہوتا ہے۔ سو وہ بھی اڑ گیا اور جاوید بھی، میں نے بیٹے کے منت ترلے اور محبت بھری باتوں میں آکر اپنا حصہ اور جو کچھ بھی تھا اسے



دے ڈالا۔ یہ بھی نہ سوچا کہ بعد میں میرا کیا بنے گا۔ اب یہ تو جاوید کی مہربانی ہے۔ اس سب کے باوجود وہ مجھے اپنے گھر میں برداشت کر رہا ہے۔ چلوں۔۔۔ مجھے گھر جاکر کھانا بھی تیار کرنا ہے۔ جاوید اور عقیلہ تو شاپنگ پر گئے ہیں۔ شاید اگلے مہینے کے وسط میں چلے جائیں۔ چلتی ہوں۔" وہ کہہ کر ایک دم سے اٹھی اور میں جی میں دل میں گہرا دکھ لیے اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔

☆ ☆ ☆

نرگس میری سابقہ منگیتر۔ ہماری منگنی ایک دو نہیں پورے ساڑھے تین برس رہی اور پھر ٹوٹ گئی۔ پہلی منگنی جوان دل کی پہلی خوشی ہوتی ہے۔

اور نرگس میری ماں کی نہیں میری بھی پسند تھی۔ اگرچہ میں نے اسے اس پسندیدگی کی نظر سے منگنی کے ڈھائی ماہ بعد دیکھا تھا۔ اس سے پہلے شاید دو ایک بار دیکھا ہوگا۔ خاندان کی کسی تقریب میں مگر اس کا چہرہ ٹھیک سے یاد نہیں تھا۔ یہ منگنی اماں کی پسند اور مرضی پر ہوئی۔ نرگس اور فاطمہ۔ نسرین خالہ کی دو ہی بیٹیاں تھیں۔ ان کے والد کا چند سال پہلے انتقال ہوگیا تھا۔ اپنے باپ کے آبائی گھر میں ماں کے ساتھ رہتی تھیں۔ اوپر والی منزل میں چچا کی فیملی تھی اور وہی ان کی کفالت کرتے تھے۔

ہماری منگنی بڑی کامیابی سے ڈھائی سال چلی۔ میری تعلیم مکمل ہونے کو تھی اور اماں سے اب انتظار مشکل ہو رہا تھا۔ میری اور بہن کی شادی وہ ساتھ کرنا چاہ رہی تھیں۔ میری بہن سلمیٰ میرے تایا ظہیر کے بیٹے سے منسوب تھی۔ اماں نے شادی کی تیاری شروع کر رکھی تھی میں اپنے چاروں دوستوں میں سب سے پہلے منگنی شدہ ہوا تھا سو وہ تینوں خوب ہی میرا ریکارڈ لگاتے۔

سلمیٰ نے جانے کیسے مجھے نرگس کی بڑی خوب صورت تصویر لا کر دی تھی جو میں نے اپنی سوکس کی کتاب میں چھپا رکھی تھی اور صولت کمبخت کے ہاتھ لگ گئی۔

وہ اب مجھے جہاں دیکھتے کورس میں گانا شروع کر دیتے۔

ہزاروں سال نرگس اپنی بے نوری پہ روتی ہے
بڑی مشکل سے ہوتا ہے چمن میں "جمشید" پیدا

میں انہیں گھورتا، ڈپٹتا، ناراض ہوتا مگر وہ کلاس میں اور باہر بھی جدھر موقع ملتا منہ پھاڑ کر شروع ہو جاتے۔

اور میرا۔۔۔ میرا عجب حال تھا۔ رات کو نرگس کی تصویر تکتے تکتے سوجاتا اور صبح کو اٹھ کر سب سے پہلے اس کی تصویر تکیے کے نیچے سے نکال کر دیکھتا تو زندگی میں انوکھے سے ولولے کا ایسا توانائی بھرا احساس جاگتا کہ بس جی چاہتا یہ بیچ کے چند ماہ پر لگا کر اڑ جائیں۔

وہ ایک بار مجھے اماں کے ساتھ وحیدہ پھوپھو کے گھر پہ ملی تھی۔

وہ اپنی تصویر سے کہیں بڑھ کر خوب صورت اور معصوم سی تھی۔ دودھیا کتابی چہرے پر گرتی اٹھتی گھنی پلکوں نے مجھے ٹھیک سے اس کی آنکھوں کی رنگت دیکھنے بھی نہ دی۔ متناسب وجود بوٹا سا قد اور چھوٹے چھوٹے گورے گورے ہاتھ پاؤں جن کو دیکھتے ہی بے ساختہ چٹکی کاٹنے کو جی چاہنے لگا تھا۔ وہ مجھے دیکھتے ہی جھپاک سے اندرونی کمرے میں چھپ گئی تھی۔ آج کا دور ہوتا تو اس موبائل انٹرنیٹ کی بدولت خود ہی ہمارا رابطہ ہو چکا ہوتا مگر یہ حسرت میرے دل میں ہی رہی۔

میرے تایا نے نرگس کے چچا کے ساتھ کوئی کاروباری سودا کیا اور اچھا خاصا نقصان بھی اٹھایا اور دونوں میں جھگڑا بھی خوب بڑھ گیا۔

"بھرجائی! اگر تم اس بنے بدمعاش موالی کی بھتیجی اس گھر میں لے کر آئیں تو سمجھ لینا ہمارا عمر بھر کے لیے جیون مرن ختم۔ یہ بات میری پتھر پر لکیر ہے۔ اسے کوئی نہیں بدل سکتا۔" تایا جی کی گھن گرج وقتی تھی نہ ان کا فیصلہ!

صرف یہی نہیں یہی فیصلہ نرگس کے چچا کا بھی تھا۔ نرگس کی دوسری بہن اس کے چچا کے گھر جانی تھی

اور میری بہن تایا کے بیٹے کی ٹھیکرے کی منگیتر۔ جس کے سائز کا اب کوئی خاندان میں لڑکا تھا بھی نہیں کہ اس امید پر اماں رشتہ توڑ ڈالتیں۔

اور میں۔۔۔ میری ان دنوں کیا حالت تھی جیسے کسی نے سربازار میری زندگی کی بولی لگادی ہو اور میں کسی بے وقعت شے کی طرح بیچ چوراہے پڑا تھا۔

"اماں! میں ہر گز تایا کے اس فضول فیصلے کو نہیں مان سکتا۔"

راتیں جاگ جاگ کر میرا دماغ ماؤف ہو چکا تھا۔ جانے کیا ہونے والا تھا دل تھا کہ ہر دم نیچے ہی نیچے کسی گہری پاتال میں اترتا جاتا۔

"تو کیا بہن کو داغ لگا کر عمر بھر کے لیے گھر بٹھالو گے۔" اماں تڑپ کر بولیں۔

"منگنی ہی کی ہے نا سلمٰی کی، کوئی نکاح تو نہیں۔" میں بول کر پچھتایا۔

"ہاں تو تیری بھی منگنی ہی تھی کوئی نکاح تو نہیں ہوا اور کس آس پر میں تمہارے تایا کی بات نہ مانوں۔ ادھر وہ رشید نے تڑی دی ہے نسرین کو۔ اگر اس طرف رشتہ کرنے کا سوچا بھی تو نہ وہ اس کی بہن کو اپنے بیٹے کے لیے قبولے گا اور نہ ان کی سرپرستی کرے گا اور نسرین بھلا ایسی نادان ہے کہ محض ایک بیٹی کی منگنی کو بچانے کے لیے دوسری بیٹی بھی داؤ پر لگا دے اور عمر بھر کے لیے بے سائبان بھی ہو جائے۔ بھول جاؤ اسے۔ وہ تیرے نصیب میں نہیں تھی۔ مجھے پتا ہے اللہ نے تیرے نصیب میں اس سے بھی سوہنی حور لکھی ہو گی۔ آخر میرے بیٹے میں کس چیز کی کمی ہے۔" آخر میں اماں نے وہی ماتا بھرے ڈائیلاگ بولے اور میں کسی جھاگ کی طرح بیٹھتا چلا گیا۔

اماں کی تسلیوں اور دلاسوں کے باوجود بھی میرا دل بہت دن نہیں سنبھلا۔

اپنی بات مان جانے کی خوشی میں تایا جی نے چھ مہینے میں ہی سلمٰی کو بہو بنا لیا اور نرگس کے چچا نے دونوں بہنوں کی اکٹھے شادی کروادی۔ میرے شکست خوردہ دل کے لیے یہ صدمہ ہی کسی پہاڑ کی طرح تھا کہ جس کی تصویر کو دیکھ کر سوتا تھا اور جسے چوم کر صبح کرتا تھا وہ میرا نہیں کسی اور کا مقدر تھا۔

اس رات۔۔۔ جب وہ کسی اور کے آنگن کی زینت بننے اتری میں نے اس کی وہ تصویر ٹکڑے ٹکڑے کر کے راکھ کر ڈالی اور اس راکھ میں جلتی چنگاریاں بہت دنوں تک میرے دل میں سلگتی رہیں۔

جنہیں ڈیڑھ سال بعد نسیمہ کی آمد نے پہلے آہستہ آہستہ پھر ہمیشہ کے لیے بجھا ڈالا اور آج۔۔۔ تینتیس برس بعد اسے دیکھا تو وہ چنگاریاں جیسے پھر سے لو دینے لگیں۔

☼ ☼ ☼
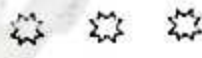
"وہ کیا کہا ہے مرزا غالب نے آم ہوں اور ڈھیرے سارے ہوں۔" میں خود ہی بولتے ہوئے ٹھنڈے ٹھار زرد اور شیریں آموں کی ٹوکری پلیٹ اور چھری میز پر رکھتے ہوئے بیٹھ گیا۔

ارم کے بھائی صاحب کل جرمنی سے تشریف لا رہے تھے اور گھر والوں کو کھانے کی شاید آج ہی سے ممانعت ہو گئی تھی۔

سب تیاریاں کل کے لیے تھیں۔ عظمیٰ بھی گھر پہ نہیں تھی اور صبح ناشتے کے نام پر دلیے کی پلیٹ ملی تھی۔

آخر دوپہر کے کھانے کے طویل انتظار کے بعد میں خود ہی چلا آیا ارم گھر پر تھی نہ شہناز بیگم۔ سو میں نے خود ہی فریج کھول کر آم نکالے اور کھانا شروع کر دیا۔ میں نے کتنے آم کھالیے۔ اس کی گنتی تو یاد نہ رہی مگر سامنے باسکٹ میں جمع ہوتے چھلکوں کے ڈھیر نے ابھی مجھے چونکایا ہی تھا کہ ارم آگئی۔

"او مائی گاڈ! اباجی حد ہو گئی۔ اتنے سارے آم آپ سب کھا گئے؟ اب جو پیٹ خراب ہو گیا یا کوئی اور مصیبت تو آپ کو دیکھیں گے یا مہمانوں کو۔۔۔ حد ہے آپ کو تو کچھ بھی خیال نہیں۔۔۔ نہ اپنا نہ اوروں کا۔ آدمی کھاتے ہوئے اپنے معدہ اپنی عمر کا تو خیال کرے۔ کھانے کی چیزیں بھلے بہت ہوں۔ پیٹ تو آپ کا اپنا

ہے۔"

وہ حسب عادت نان اسٹاپ بولتی چلی گئی اور میں بوکھلائے ہوئے انداز میں آم کے شیرے میں لتھڑے ہاتھ اور منہ کو آستینوں سے صاف کرتا اٹھ گیا۔

اب یہ ارم کی نظر تھی یا واقعی میری عمر کے مطابق میرا معدہ جواب دے گیا تھا۔

شام کو جو مجھے موشن شروع ہوئے۔ رات بھر میں انہوں نے مجھے نچوڑ ڈالا اور صبح دم میں باتھ روم کے دروازے سے نکلتے ہوئے وہیں بے دم ہو کر گر پڑا۔

"افوہ! ابا جی کو آج ہی ہسپتال میں ایڈمٹ ہونا تھا۔ نوید فلائٹ کا ٹائم ہو رہا ہے کیا کریں ادھر ان کی پائنتی کے ساتھ چپک کر بیٹھے رہیں۔" میں نیم غنودگی میں تھا جب میں نے ارم کی جھنجلائی ہوئی آواز سنی۔

"اور یہ عظمیٰ بھابی اور بھائی کو بھی آج ہی شہر سے باہر شادی پر جانا تھا۔ کیا سوچے گا یاسر اور اس کی بیوی۔" وہ غصے میں بل کھا رہی تھی۔

"اب کیا کیا جا سکتا ہے۔" نوید لاچاری سے بولا۔

"اوہو تو فلائٹ آنے میں گھنٹہ رہ گیا ہے۔ وہ بیچارے ایئرپورٹ پر خوار ہوں گے۔ چلیں یہاں نرس ڈاکٹر تو موجود ہیں ہی۔" وہ جھلاہٹ میں اٹھ کھڑی ہوئی۔

اسی وقت عقیلہ اور نرگس، جاوید کے ساتھ شاید میری عیادت کو آئے تھے اندر داخل ہوئے اور جیسے ارم اور نوید کا مسئلہ بھی حل ہو گیا۔

وہ ذرا سی دیر کے بعد عقیلہ اور جاوید سے بڑی انکساری سے دو گھنٹے کے لیے میرے پاس آنے کی استدعا کر رہے تھے۔

"ایکچوئلی ہم تو انکل کی خیریت دریافت کرنے آئے تھے۔ بچے گھر میں ملازمہ کے پاس ہیں۔ امی کو ڈاکٹر کو دکھانا تھا۔ ان کی کچھ طبیعت ٹھیک نہیں تھی یوں بھی نو تو بج رہے ہیں۔" عقیلہ اور جاوید اس خوامخواہ کی افتاد سے گھبرا کر بولے۔

"چلیں کوئی بات نہیں۔ آپ کا پرابلم بھی جینوئن ہے۔ ظاہر ہے بچوں کو اکیلا تو نہیں چھوڑا جا سکتا ویسے یہاں ڈاکٹر نرسیں موجود ہیں۔ میں ارم کو اور مہمانوں کو گھر ڈراپ کر کے آجاتا ہوں۔ دو گھنٹے تو لگیں گے۔ ابا جی کو تو ڈاکٹر آج کی رات رکھیں گے۔ آپ کا بہت شکریہ۔" نوید نے ان کی معذرت قبول کرتے ہوئے کہا۔

پھر وہ آگے پیچھے باہر جانے لگے۔

"عقیلہ بیٹی ــــ! اگر میں رک جاؤں تو۔ میرا مطلب ہے یہ اکیلے ہیں اگر کوئی مسئلہ ہو جائے تو۔" میرا ذہن اب پوری طرح سے بیدار ہو چکا تھا جب میں نے دروازے کے پاس رک کر نرگس کو کہتے سنا۔

"لیکن امی! آپ کی طبیعت بھی تو اچھی نہیں۔" عقیلہ ہمدردی سے بولی۔

"اب تو بہتر ہوں پھر دو گھنٹے کی تو بات ہے۔ نوید بیٹا آجائے گا تو میں آجاؤں گی۔" وہ آہستگی سے بولی۔

"جی آنٹی! میں آتے ہوئے ڈرائیور کو ساتھ لے آؤں گا، وہ آپ کو فوراً گھر چھوڑ آئے گا۔" نوید جلدی سے بولا تو پھر کسی کو بھی خاص اعتراض نہ ہوا۔

ان کے جاتے ہی ہر طرف خاموشی سی چھا گئی اور ڈراپ کے مسلسل گرتے قطروں نے ایک بار پھر مجھے غنودگی میں کر ڈالا۔

مجھے ایسا لگا نسیمہ میرے پاس کرسی ڈالے بیٹھی ہے۔ طاہر اور نوید میرے بیٹے شاید ہوم ورک کر رہے ہیں۔ مجھے یرقان ہوا تھا اور میں نے بے ساختہ نسیمہ کا ہاتھ تھام کر کہا۔

"مجھے کچھ ہو رہا ہے میں ــــ میں شاید مر جاؤں گا۔"

"نہیں نہیں، اللہ نہ کرے آپ کو کچھ ہو۔ معمولی سی ڈی ہائیڈریشن ہے ایک اور ڈرپ لگے گی اور آپ ٹھیک ہو جائیں گے۔" میں آواز سنتے ہی جیسے گہری نیند سے بیدار ہو گیا۔

میں نے نرگس کے ہاتھ پر اپنا ڈرپ والا ہاتھ رکھا ہوا تھا جسے وہ بڑی احتیاط سے دوبارہ بیڈ پر رکھ رہی تھی۔

میں شرمندہ سا ہو گیا۔



"نوید اور ارم کہاں گئے؟" میں نے شرمندگی کے احساس سے نکلنے کے لیے پوچھا۔

"ایئرپورٹ گئے ہیں۔ اب تو آنے والے ہوں گے۔" نرگس نے گھڑی پر ٹائم دیکھ کر کہا۔

"دیکھا۔ یہ حال ہوتا ہے آخری عمر میں جب ساتھی وقت سے پہلے ساتھ چھوڑ جائے تو سگی اولاد ــــ ان بچاروں کا بھی کیا قصور۔ وہ تو ابھی زندگی کی ریس میں جتے ہیں۔ ہم جیسے کم رفتار بوڑھے گھوڑوں کے ساتھ کب تک دل مار کر جڑے رہیں۔ مگر ہوتا یہی ہے ــ ہے نا۔" میں خود ترسی کے انداز میں بولا۔

"ہوں۔" اس نے آہ سی بھر کر مختصراً کہا۔

"تمہاری طبیعت تو اچھی ہے؟" مجھے خیال آیا۔

"ہاں ٹھیک ہوں کیا ہونا ہے۔" وہ دیوار کو تکتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

"جاوید سے بات کی تم نے؟" میں ذرا دیر بعد بولا۔

"کس سلسلے میں؟"

"اپنے سلسلے میں!"

"نہیں اور سچی بات ہے جمشید! میں خود بھی ان کے ساتھ کسی طور جانا نہیں چاہ رہی۔ اور پتا ہے کامران کا پرسوں خط آگیا ہے کہ اس نے اگلے مہینے کی تین تاریخ کی سیٹ کنفرم کرالی ہے۔ عقیلہ بے چاری کے دل سے بھی جیسے بوجھ اترا۔ ان کی دو تاریخ کی ٹکٹیں کنفرم ہیں اور کامران تین کو آرہا ہے۔ اب تو کوئی مسئلہ ہی نہیں۔" وہ سر جھٹک کر خوشی خوشی بتا رہی تھی۔

اور تھوڑی دیر پہلے والی پژمردگی اور غم کا نشان بھی چہرے پر نہیں تھا۔

مجھے اس کے پرسکون چہرے کو دیکھ کر رشک سا آیا۔

"نوید مہمانوں کو چھوڑ کر اتنی جلدی آنے والا نہیں۔ اول تو وہ ادھر آنا بھول چکا ہوگا۔ دوسرے اسے ارم اتنی جلدی آنے بھی نہیں دے گی اور یہ بے چاری میری وجہ سے بندھ کر بیٹھی رہے۔" میں آنکھیں بند کر کے سوچنے لگا۔

"اگر نیند آرہی ہے تو سو جائیں۔ ایئرپورٹ سے گھر کا فاصلہ کم تو نہیں پھر ہاسپٹل آنا ــــ نوید آجائے گا آپ ٹینس نہ ہوں۔" اس نے جانے کیسے میرا ذہن پڑھ لیا اور میں نے واقعی ایک دم سے ریلیکس ہو کر آنکھیں موند لیں۔

☼ ☼ ☼

"دادا! یہ کیا ہے؟" ولید بارش میں بھیگا سفید رنگین حاشیے والا لفافہ ہاتھ میں لیے اچھلتا ہوا آیا۔

اس کے دوسرے ہاتھ میں نگٹس کی پلیٹ تھی جسے وہ مزے لے لے کر کھا رہا تھا۔ میرا دھیان اس کی پلیٹ کی طرف تھا۔

"کیا کھا رہے ہو دادا کو نہیں دو گے؟" میں نے للچائے ہوئے انداز میں کہا۔

"نہیں۔" اس نے فوراً پلیٹ پیچھے کر لی۔

"کیوں بھئی؟" مجھے غصہ سا آیا۔

"ماما نے منع کیا ہے۔ دادا کو کوئی الٹی سیدھی چیز نہیں دینا ورنہ یہ پھر بیمار پڑ جائیں گے تو ان کے پاس ہاسپٹل میں کون رہے گا۔" وہ توتلا ولید جسے ابھی ڈھنگ سے جملے بنانے بھی نہیں آتے تھے بڑے آرام سے ماں کا پورا پیغام نشر کر گیا۔

اور جس طرح اچھلتا کودتا آیا تھا اسی طرح اچھلتا لان میں چلا گیا۔ تیز بارش کے بعد اب ہلکی ہلکی بوندا باندی ہو رہی تھی۔ فضا میں تلے ہوئے پکوان کی خوشبو دھوم مچاتی پھر رہی تھی کہ ساون آیا ہے اور مجھ پر اس ساون کی ہر نعمت حرام کر دی گئی تھی۔

"نہیں ابا جی! پراٹھے اچار ــــ توبہ اپنا معدہ دیکھا ہے آپ نے۔ پورے تین دن ہاسپٹل رہ کر آئے ہیں۔ پکوڑے! سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ حلوہ پوری ــــ اپنا نہیں تو ہمارا ہی خیال کر لیں۔" سن سن کر میرے کان پکنے لگے۔

اس رات نوید ہسپتال آنا بھول گیا تھا یا جان بوجھ کر نہیں آیا تھا۔ اس بچاری نرگس کو وہیں ہسپتال کے صوفے پر آڑے ترچھے ہو کر رات گزارنی پڑی جسے صبح آنے والی نرس میری بیگم سمجھ کر کھانے پینے کا

چارٹ اور دوائیوں کا ٹائم ٹیبل سمجھاتی رہی جہاں وہ بیچاری کھسیانی ہوتی رہی وہیں میں کچھ شرمندہ کچھ خوش اور اپنے بیٹوں کی غیر ذمہ دارانہ حرکت سے خفا ہوتا چلا گیا۔

نوید صبح سویرے معافی تلافی کرتا آیا مگر میں نے اس سے بات نہیں کی۔

اور طاہر میاں شادی سے لوٹ آنے کے بعد بھی تین دن تک اپنے سسرال میں ڈیرے ڈالے بیٹھے رہے اور گھر آکر کبھی اسے میری طبیعت کا پوچھنا یاد نہیں رہا۔

بیٹوں کی محبت اور ان کی توجہ کا طالب میرا دل مرجھاتا ہی چلا گیا۔ گھر کے اندرونی حصے سے میری جگہ ختم ہونے کے بعد اب ان کی دلوں اور مصروفیت میں بھی میرا دھیان سکڑتا چلا گیا۔ پھر گھر میں آئے مہمانوں کی وجہ سے وہ جو تین ٹائم کی میری کھانے پر حاضری ضروری سمجھی جاتی تھی وہ بھی ناگوار گزرنے لگی۔

"شہناز یا عبدل کھانا میرے کمرے میں ہی لے آتے۔ کھانا کیا ہوتا پھیکی دال دلیہ سبزی یا بدمزہ سالن ــــ میرا کھانے پینے سے جی اچاٹ ہو گیا۔

عظمٰی کبھی کبھار جب اسے اپنے کاموں سے فرصت ملتی کوئی اچھا کھانا لے آتی تو دو گھڑی میرے پاس بیٹھ بھی جاتی۔

اور آج کل تو ارم اور نوید بھی اپنی اتنی زیادہ مصروفیت میں سے ٹائم نکال کر میرے پاس آکر بیٹھنے لگے تھے جس کا عقدہ رات کو حل ہو گیا۔

"ابا جی! آپ نے جو رقم بینک میں فکس کرا رکھی ہے اس کا جتنا پرافٹ آپ کو ملتا ہے وہ میں آپ کو دے دیا کروں گا۔ وہ رقم آپ مجھے بطور قرض دے دیں تین سالوں کے لیے۔ میں یاسر کے ساتھ جوائنٹ شیئرز خرید رہا ہوں اور آپ کو پتا ہے الگ سے رقم تو میرے پاس ہے نہیں۔ تنخواہ میں سے بدقت گھر کا خرچ ہی نکلتا ہے۔" وہ بڑی معصومیت سے کہہ رہا تھا اور ارم تابعداری سے سرہلا رہی تھی۔

"تو سوچو ذرا اگر تمہارا یہ فالتو بوڑھا باپ اسی طرح تنخواہ میں سے اپنا اور بیوی بچوں کا من مار کر تم لوگوں کے لیے یہ شاندار گھر بھی نہ بناتا تو آج تم لوگ کیسے کرائے کے گھروں میں دھکے کھا رہے ہوتے ــــ تمہیں تو ابھی اس قسم کی کوئی دردِ سر نہیں۔" میں نے بے لحاظی سے کہا تو دونوں چپ سے ہو گئے۔

"تو وہ رقم بھی تو ابا جی ظاہر ہے آپ نے اپنے لیے ــــ ہمارے لیے ہی جمع کر رکھی ہے۔" نوید بڑی محبت سے میرا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر بولا۔

"نہیں صاحبزادے! وہ میں نے اپنے انہیں برے دنوں کے لیے محفوظ کر رکھی ہے جو آج کل مجھے اپنے قریب آتے نظر آ رہے ہیں۔" میں تلخی سے بولا تو وہ دونوں پھر کچھ بھی نہ کہہ سکے۔

ہاں اگلی صبح سفارش کے لیے عظمٰی اور طاہر کو بھی لے آئے۔

"ابا! صرف رقم کی تو بات ہے پھر وہ آپ کو پرافٹ بھی دے گا۔ کون سا گھر کی بات کر رہا ہے۔" طاہر بھائی کی محبت کے جوش میں بولا۔

"گھر کی کیسی بات؟" میں سمجھتے ہوئے بھی انجان بن کر بولا۔

"ظاہر ہے گھر بھی تو ہم دونوں کا ہی ہو گا اگر۔" وہ جتانے والے انداز میں بولا۔

"پر ایک اہم بات تم دونوں بھول رہے ہو۔ ابھی میں زندہ ہوں مرنے سے پہلے چاہوں تو گھر تم دونوں کے نام کروں یا کسی خیراتی ادارے کے ــــ میری مرضی ــــ ہے نا!" اور وہ دونوں میرے اس کٹھور انداز پر لاجواب سے ہو گئے۔

"وراثت کے شرعی اور اصولی قوانین سے آپ انکار نہیں کر سکتے؟" نوید دبی آواز میں بولا۔

"خوب اب اپنے اس نکتے کو یاد رکھنا۔ شاید اسے مجھے بھی کوٹ (quote) کرنا پڑے۔" میں طنز سے بولا اور وہ چاروں ناکام سے اٹھ کر چلے گئے۔

ایسا نہیں تھا مجھے اپنے بیٹوں سے کوئی عداوت تھی یا میں انہیں نافرمان سمجھتا تھا یا خدانخواستہ انہیں عاق کرنے کا ارادہ رکھتا تھا بلکہ نوید آج کل جس طرح



اپنے سالے سے متاثر ہو کر بنا سوچے سمجھے کہ اسے بزنس کا کوئی تجربہ نہیں تھا جس طرح رقم لگانا چاہتا تھا، میں اس کے حق میں نہیں تھا۔

اور اب جیسے گھر بھر مجھ سے خفا ہوا بیٹھا تھا۔

"ہوا کرے مجھے پروا نہیں۔" فضا میں پھیلتی پکوان کی سوندھی سوندھی خوشبو نے جیسے مجھے چڑا دیا۔

میں اٹھا تو میری گود سے کچھ نیچے گرا۔

یہ وہی خط والا لفافہ تھا جو ولید ابھی دے کر گیا تھا۔

لفافے کا شاید منہ صحیح طرح سے بند نہیں ہوا تھا یا بارش کے پانی کی وجہ سے کھل گیا اور میں نے غیر اخلاقی حرکت کرتے ہوئے اس ادھ کھلے لفافے کو مزید چاک کر ڈالا۔

اندر سادہ کاغذ تھا۔

باہر ایڈریس اور نام نرگس کا تھا میں سادہ بھیگا لفافہ دیکھ کر مخمصے میں پڑ گیا۔

"آج یکم ہے اور پرسوں کامران نے آنا ہے۔ کل علی الصبح عقیلہ اور جاوید نے جانا ہے تو پھر اس خالی کاغذ کا مطلب؟" میں کچھ دیر بیٹھا الجھتا رہا اور پھر ایک فیصلہ کر کے کھڑا ہو گیا۔

☼ ☼ ☼

"آپ کے لیے پکوڑے اچھے نہیں انکل!" عقیلہ میرے آگے پکوڑوں کی پلیٹ اور چائے رکھتے ہوئے بولی۔

"پکوڑوں کا تعلق طبیعت کے اچھے برے ہونے سے نہیں ہوتا بلکہ موسم سے ہوتا ہے۔" میں نے ہر احتیاط، پرہیز پشت ڈالتے ہوئے پکوڑے کھانا شروع کر دیے تھے۔

"تمہاری امی کہاں ہیں؟"

"کچن میں۔ آ رہی ہیں۔"

"تم لوگوں کی کل صبح کو روانگی ہے؟" میں نے یونہی پوچھا۔

"جی بالکل انشاءاللہ۔"

"اور کامران؟"

"بھائی کی فلائٹ کل رات بارہ بجے کی ہے۔"

"فون آیا ہو گا؟"

"نہیں مجھ سے تو وہ ناراض ہے بلکہ جاوید ناراض ہیں اس سے اور سالوں سے اس کے ہمارے بیچ رابطہ نہیں۔ امی کے پاس ہی اس کے خط آتے جاتے ہیں اس میں لکھا تھا۔" وہ کہہ کر اندر چلی گئی اور میں کچھ سوچنے لگا۔

"یہ تمہاری امانت۔" جانے سے پہلے میں نے جیب سے وہ بھیگا مڑا تڑا لفافہ نکال کر نرگس کو دیا جو نواسے کو آلو کے چپس توڑ توڑ کر کھلا رہی تھی۔

"ہاں یہ کامران کا خط آیا ہو گا کہ ــــ" اس نے جوش میں لفافہ پکڑا اور اس کا کھلا ہوا منہ دیکھ کر چپ سی رہ گئی۔

"بارش میں بھیگنے کی وجہ سے پہلے ہی کھل چکا تھا اندر صرف سادہ کاغذ تھا۔" میں نے صاف گوئی سے کہا اور اس کا ہاتھ ڈھیلا ہو کر گود میں گر گیا۔ وہ سر جھکا کر بیٹھی تھی۔

"تم یہ دھوکا خود کو دے رہی ہو یا اپنی بیٹی کو بیوقوف بنا رہی ہو!" میں کچھ دیر بعد بولا۔

اس کا سر اسی طرح جھکا ہوا تھا وہ شاید رو رہی تھی۔

"تم کم از کم اپنی بیٹی سے تو صاف بات کر سکتی ہو۔ بیٹیاں تو ماں باپ کے دکھ کو سمجھتی ہیں۔"

"سمجھتی ہیں ــــ مگر کیا اسے یہ سمجھا کر میں اس کا گھر برباد کر ڈالوں کہ یہ تمام تر خط میں خود ہی اپنے نام لکھتی ہوں اپنے بیٹے کی طرف سے کہ اس کے دل کو تسلی رہے کہ اس کے جانے کے بعد اس کی ماں اکیلی نہیں رہے گی۔" وہ رندھے ہوئے گلے سے بولی تو مجھے بے حد ترس آیا اس پر۔

"کیا اسے کبھی پتا نہیں چلا کہ ان لفافوں پر باہر کے ڈاک خانوں کی کوئی مہر نہیں ہوتی کوئی ٹکٹ نہیں صرف لفافہ ــــ"

"اس بات سے کیا فرق پڑتا ہے اسے پتا ہے یا نہیں ــــ اس کی تسلی کے لیے یہی کافی ہے کہ اس کی ماں اس کے جانے کے بعد اکیلی نہیں رہے گی۔" وہ تلخی

سے اس بھیانک سچائی سے پردہ اٹھاتے ہوئے بولی جس سے شاید عقیلہ جاتے ہوئے بھی انجان بنتی رہی تھی۔

وہ اس کے جانے کے بعد اس کرائے کے گھر میں اکیلی کیسے رہے گی؟ شوہر کی پینشن سے کرایہ و دیگر گزارا کیسے کرے گی۔ وہ ان تمام مسائل سے آنکھیں بند کر کے ماں کو مصنوعی عافیت کے حوالے کر کے صرف اپنا گھر بچانے کے لیے جا رہی تھی کہ اس کے شوہر کو اس کی ماں کو ساتھ رکھنا قطعی پسند نہیں اور اس کا بھائی۔۔۔

"اور کامران۔۔۔ اس کے بارے میں۔"

"میرا خدا جانتا ہے یا وہ خود۔۔۔ اس نے جانے کے تین ماہ بعد تک مجھے باقاعدگی سے خط لکھے اور فون بھی کیے۔ آخری خط میں اس نے ایک انگریز لڑکی سے شادی کرنے کا لکھا اور کسی اور شہر جانے کا۔۔۔ اس کے بعد اس کا کوئی خط نہیں آیا اور میں اس طرح اپنی طرف سے خط لکھ لکھ کر خود کو، سب کو دھوکا دیتی رہی اور دل میں اس کی سلامتی کی دعائیں مانگتی رہی اور کیا کرتی۔" وہ بے بسی و لاچاری کی انتہا پر تھی اور میں یک ٹک اس کے باون سالہ چہرے کو دیکھتا رہا جو آج بھی کتابی تھا اور اس کتاب کا جیسے ہر صفحہ میں نے پڑھ لیا تھا جس پر ایک ہی سطر لکھی تھی غم اور خود فریبی۔۔۔ اولاد کی سلامتی، اس کی خوشیاں اور بس۔۔۔

میں اسے تادیر دیکھتا رہا اور وہ سر جھکائے آنسو بہاتی رہی۔ مجھے لگا میری زندگی تینتیس برس پیچھے چلی گئی ہے۔

ایک بار پھر اسے میری ضرورت تھی۔

تینتیس سال پہلے میں نے اپنی ماں، بہن، خاندان کے خوف سے، سماجی رشتوں کی زنجیروں سے ڈر کر بغاوت کی تھی نہ اس کے لیے آواز اٹھائی تھی جو جذبات ان ساڑھے تین برسوں میں انچ انچ میرے دل میں ننھے پودے کی طرح بڑھے تھے کیا اس کے دل میں نہ جڑ پکڑ سکے ہوں گے؟ وہ تو لڑکی تھی لڑکیاں۔۔۔ جو پہلی منگنی کے بارے میں حد درجہ حساس ہوتی ہیں اور میں۔۔۔ مرد ہو کر کچھ نہ کر سکا تو وہ بے چاری لڑکی ہو کر کیا کر لیتی۔

اور آج تینتیس سال بعد وہ پھر سے بے آسرا بیٹھی آنسو بہا رہی تھی اور کسی سے اپنے دل کا دکھ شیئر نہیں کر سکتی تھی۔ سوچے جا رہا تھا اور گھر آنے تک میں دل میں مصمم فیصلہ کر چکا تھا۔

☆ ☆ ☆

وہ فیصلہ جو تینتیس سال پہلے میں اپنے والدین کی وجہ سے نہیں کر سکا تھا آج اپنی اولاد کی وجہ سے نہیں کر پا رہا تھا۔

میرا زبان کھولنا ہی ایک طوفان کا پیش خیمہ ہوا۔ اس رات آسمان ہی نہیں گرج اور برسا ہمارے گھر میں بھی بھونچال سا آ گیا تھا۔

میرے دونوں بیٹے تو جیسے بپھر اٹھے تھے اور بہوؤں کے چہروں اور ہونٹوں پر کیسی تضحیک آمیز طنزیہ مسکراہٹ تھی جیسے کہہ رہی ہوں "بوڑھی گھوڑی لال لگام۔"

بہت سارے محاورے تھے اور بہت سارے چٹکلے! مگر میں نے یہ سب کچھ پہلے سے سوچ لیا تھا۔

"جب تم لوگوں کے پاس مجھ بڈھے کے لیے دس منٹ نہیں۔ اس کے لیے کوئی ہمدردی، محبت یا اس کی تنہائی کا احساس نہیں۔ گھر کے فالتو سامان کی طرح اٹھا کر گیٹ کے پاس لا پھینکا۔ میں نے کوئی اعتراض نہیں کیا۔ تم لوگوں کی مصروف زندگیوں میں نہ کبھی دخل دیا، نہ اپنے لیے کچھ مانگا۔ اب اگر میں اپنی تنہائی اپنا اکیلا پن دور کرنے کے لیے کسی کا ساتھ چاہ رہا ہوں تو تم لوگوں کو اعتراض کا کوئی حق نہیں۔" میں نے ان کے منہ پر دوٹوک کہہ ڈالا۔

رات کے دس بجے عقیلہ میرے پاس آئی کچھ گم صم سی کچھ حیران پریشان اور تھوڑی شرمندہ!

میرے گھٹنوں کو ہاتھ لگا کر رو پڑی۔

"انکل! میں کچھ کچھ سمجھتی تھی اور کچھ نہیں مگر اپنی خود غرضی کی وجہ سے انجان بنے رہنے میں عافیت سمجھتی تھی۔۔۔ مگر پھر بھی میرے دل کو چین نہیں تھا۔ آپ نہیں جانتے میں نے جاوید سے کتنی لڑائیاں لڑی ہیں مگر۔۔۔ وہ ان مردوں میں سے ہے جو اپنے دل کا کینہ عمر بھر نہیں نکالتے۔ وہ بھائی کے لیے امی کی حمایت کو کبھی فراموش نہیں کر سکتے۔ میں جانتی سب ہی لوگ مذاق اڑائیں گے شاید جاوید بھی بلکہ وہ تو اتنی حقارت سے بات کرتے ہیں امی سے کہ میرا دل کٹ کٹ جاتا ہے۔ وہ اکیلی۔۔۔ میرے گھر میرے بچوں کی یوں خدمت کرتی ہیں جیسے کوئی کل وقتی ملازمہ۔۔۔ صرف میرا گھر بچانے کے لیے۔" وہ ہچکیوں سے رو رہی تھی۔ "میں بظاہر بے حس بنی رہتی ہوں مگر۔۔۔ انکل! میں آپ کے ساتھ ہوں۔ امی آپ کے اتنا سمجھانے پر بھی راضی نہیں تھیں مگر میں نے ان کے پیروں کو ہاتھ لگا کر انہیں منا لیا ہے۔ اب میں کتنے سکون کے ساتھ یہاں سے جا سکوں گی، یہ میرا دل ہی جانتا ہے۔"

بیٹیوں کے دل ماں باپ کی محبت میں کتنے وسیع ہوتے ہیں اس کا اندازہ مجھے عقیلہ کے رد عمل اور اپنے بیٹوں کے رویوں سے بخوبی ہو گیا تھا۔

کیا انہیں میری تنہائی میرا اکیلا پن محسوس نہیں ہوتا تھا؟ میں شاید دو چار سال اور ہوں یا پانچ دس برس۔ کیا ستاون سال کی عمر میں آدمی پر ہر خوشی ہر رعایت حرام ہو جاتی ہے؟

ساری زندگی مشقت کی چکی میں پسنے والے ہاتھ اگر اپنے لیے اس آخری عمر کے لیے کوئی ساتھی، کوئی رفیق مانگ لیں تو وہ قابل تعزیر ہوں گے؟ قابل تضحیک؟

مگر اب مجھے کسی بات کی پروا نہیں تھی۔ ان کے بے نیاز رویوں نے ہی مجھے بے پروا بنایا تھا اور میرے لیے فیصلہ کرنا آسان ہو گیا۔

☆ ☆ ☆

اسی رات ہم دونوں کا نکاح ہو گیا۔

جس کے دو گھنٹے بعد عقیلہ اور جاوید بچوں کے ساتھ مجھ سے ایک نیا رشتہ استوار کر کے رخصت ہو گئے اور نرگس ساتھ والے کرائے کے گھر سے اٹھ کر میرے دو کمروں کے گیسٹ روم میں آ گئی۔

سادہ کاٹن کے لباس میں روئی متورم آنکھیں، سوجا ہوا چہرہ، شرمساری کی بکل میں لپٹی وہ مجھے روز اول کی طرح اپنی اپنی سی لگی تھی۔

"تمہاری شریک سفر کا نام ن سے ہو گا اور تم دو شادیاں کرو گے۔" شمس ہم دوستوں میں بہت بڑا منجم تھا اور ہم ہمہ وقت اس کو ذلیل کرتے رہتے تھے۔ اس نے جب یہ پیش گوئی کی تو سب نے اس کی خوب درگت بنائی تھی کہ تمہیں پہلے سے پتا ہے اس کی منگیتر کا نام نرگس ہے اور دوسری شادی کی گپ تو اپنے علم کی دھاک بٹھانے کے لیے لگا رہا ہے۔"

اور آج جانے وہ میرا منجم دوست کہاں ہے جس کی پیش گوئی میری عمر کے ستاونویں سال میں پوری ہوئی تھی اور وہ بھی مکمل۔۔۔ "ن" کے ساتھ میری ہمراہی اور اس حرف کے لیے میرے دل کی چاہت پر تقدیر نے "لیس" کی مہر دوبارہ لگا کر گویا مجھے باقی کی عمر سجدہ شکر کے لیے باندھ لیا تھا۔

میں جانتا ہوں کل کی صبح اور اس کے بعد آنے والے کئی دن ایک بار پھر سماج میرے اس فیصلے کو بے تحاشا تنقید کا نشانہ بنائے گا۔ ہو سکتا ہے آپ کو بھی میرا یہ فیصلہ اخلاقی بے راہ روی لگا ہو مگر مجھے صرف یہ اطمینان ہے کہ آنے والی شاموں میں میں پارک میں اکیلا واک کرنے نہیں جاؤں گا۔ پیروں کے درد سے نڈھال ہوں گا تو کوئی میرا ہاتھ تھامنے والا ساتھ ہو گا۔ مجھے اس سے زیادہ چاہیے بھی نہیں!